Vol. 7 No.3 2023

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

پاکستان میں نفاذِ اردو کا تہذیبی اور فکری پس منظر

ڈاکٹر محمد عطاالله

اسسٹنٹ پروفیسر،لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر عامر اقبال

اسسٹنٹ پروفیسر،لاہور لیڈز یونیورسٹی،لاہور

حافظ غلام مرتضیٰ

لیکچرار، لاہور لیڈز یونیورسٹی لاہور

Abstract

In the course of history we have observed a great paradigm shift during 19th and 20th century in the social, Moral, philosophical and political phenomena of the Indian subcontinent. Urdu, being the lingua franca of the region has suffered the most in this course as it was first used politically to eliminate the Persian from the domains of powers and the offices and then made the language of subordinates by deviding the education system English and vernacular streams. After independence it was expected that Urdu will be given the status of National language and will be used in domains of powers but unfortunately it could not happen due to certain reasons. This essay focusses on the impact of this paradigm shift on Urdu language in Pakistan and is an effort to answer the question that why Urdu, in spite of being the national language of the country, could never become the language of the corridors of the domains of power and remained an unimportant ritual and an unwanted song to be sung by the people whose voice is not loud enough to be heard where the decisions are made. In the 21st century we are facing even worst situation when globalization has changed the paradigm once again and new generations have gone further away from the position they were in. The essay concentrates on the core reasons that effected the social and political status of the Urdu language during this period of time.

پاکستان میں نفاذِ اردو کے راستے میں حائل مشکلات کا ایک مخصوص تاریخی اور تہذیبی پس منظر ہے۔ یہ پس منظر انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں پیراڈائم کی اس تبدیلی سے مرتب ہوتا ہے جس نے ہمارے نظامِ فکر کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جب لارڈ میکالے نے ہمارے قدیم تعلیمی ڈھانچے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے نئے تعلیمی نظریات پیش کیے۔ لارڈ میکالے کے اِن نظریات کو طنز اور تنقید کا نشانہ تو بنایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس دور کے تعلیمی نظام اور علمی خزانے پر اس کی تنقید اتنی بھی بے بنیاد نہیں تھی۔ اور ہماری تہذیبی تاریخ میں وہ پہلا مرحلہ تھا جس نے ہمیں آج اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ ہم اپنے طلبا کو اور اپنی اولاد کو اُن کی مادری زبان اردو میں تعلیم دیتے ہوئے اُن کے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لارڈ میکالے نے اپنے اس مشہور خطبے میں سنسکرت کالج سے فارغ التحصیل طلبا کی طرف سے پیش کی جانے والی ایک درخواست کا حوالہ دیا ہے جس میں اُن طلبا نے کہا تھا کہ وہ سنسکرت زبان میں ہندی ادب اور سائنس کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور اب چاہتے ہیں کہ حکومت انھیں ملازمت دے تا کہ وہ معاشرے میں باعزت روزگار حاصل کر سکیں۔ اس درخواست میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ وہ طلبا کوئی اعلیٰ عہدہ یا مقام نہیں چاہتے بلکہ

Vol. 7 No.3 2023

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

صرف اتنا روزگار چاہتے ہیں جو اُن کی بقا کا ضامن بن سکے۔ اس موقع پر لارڈ میکالے نے بڑی شدت سے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اس ملک کے عوام کو ایسی تعلیم نہیں دینی چاہیے جو اُن کے لیے بے کار ہو اور انھیں مستقبل میں کوئی معاشی تحفظ فراہم نہ کر سکے اس طرح لارڈ میکالے کی یہ دلیل ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقطہ آغاز اور تبدیلی کا پہلا مرحلہ تھی۔ اس خطبے کے اثرات کے تحت سامنے آنے والی تعلیمی پالیسی میں بنیادی نکتہ یہی تھا کہ تعلیم کے ذریعے ایسے مفید افراد پیدا کیے جائیں جو حکومتِ وقت کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کریں۔

اب اگر عوام کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ افراد جو حکومتِ وقت کے لیے مفید تھے در حقیقت اس معاشرے کے خوشحال، طاقت ور اور باعزت افراد تھے یہ وہ لوگ تھے جو نئے زمانے کی تہذیبی نفسیات کا رُخ متعین کر رہے تھے۔ اس نئے دور میں جہاں تعلیم کی افادیت اور مستقبل میں اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس اجاگر ہو رہا تھا۔ چنانچہ تہذیبی تبدیلی کے اس پہلے مرحلے میں اس خطے کے عوام نے یہ شعور حاصل کیا کہ ایک ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے اگر وہ مفید تعلیم حاصل کرتے ہیں تو بہتر مستقبل کا دعویٰ اپنے حق کی حیثیت سے کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی عزتِ نفس بر قرار رکھتے ہوئے صاحبِ اقتدار طبقے کی منت اور اُن کی کاسہ لیسی کے لیے "حسنِ طلب" جیسی فنکاری سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

اس تہذیبی تبدیلی کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جب سر سید احمد خان نے سائنٹفک سوسائٹی کے دور کے اپنے ہی خیالات کو رد کرتے ہوئے واشگاف لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہمارے قدیم علوم اور ہمارا قدیم نظامِ تعلیم اب بے کار ہو چکا ہے اور اب جدید علوم کی طرف راغب ہونے کی ضرورت ہے اس ضمن میں اُن کا ایک مضمون بعنوان "ہماری زبان اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم" بہت اہم ہے۔ یہ مضمون لکھنے کی غرض و غایت اور اس کا پس منظر یہ تھا کہ سر سید احمد خان نے اس سے قبل دو مضامین پنجاب یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت میں لکھے تھے۔ ان مضامین میں انھوں نے اس خیال پر تنقید کی تھی کہ ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہونی چاہیے۔ اُن کے اِن مضامین پر اعتراضات ہوئے اور خصوصیت سے یہ طعنہ دیا گیا کہ سائنٹفک سوسائٹی کے تحت وہ خود مشرقی علوم اور زبانوں کی تعلیم اور ترقی کے ہم خیال رہے ہیں اور اب پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی علوم و لسانیات کی تدریس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات کے جواب میں سر سید نے یہ مصمون لکھا جو ہماری تہذیبی تاریخ کا انتہائی اہم مضمون ہے اس مضمون کے کچھ اقتباسات اور تبصرہ ملاحظہ کریں۔ ابتدا میں وہ لکھتے ہیں۔

"بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت کچھ توجہ کی مگر وہ ایک کو بھی اُن پنڈتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھوتی باندھے، کمری پہنے منکنکا اور شوالہ گھات کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی مقدس سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ اس کی تحصیل سے ملک کو بجز اس کے کہ بنارس میں دس پانچ منگتا پنڈت اور زیادہ ہو گئے کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ یونیورسٹی کالج نے بلخ و بدخشاں کے طالبِ علموں کو جو کچھ تعلیم دی ہو ہم کو اس کا حال معلوم نہیں مگر آج تک اس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں ان لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنھوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود و فاتحہ کی روٹیوں پر گزارا کر کے عربی اور فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحر اس میں پیدا کیا مگر اس کا نتیجہ؟ بجز اس کے کہ مُردوں کی روٹیاں کھانے والے زیادہ ہو گئے ملک کو کیا فائدہ پہنچا"۔]1[

یہاں ایک مسلمان رہنما کی طرف سے مشرقی علوم کی افادیت اور اہمیت پر سخت تنقید نظر آ رہی ہے۔ اس اقتباس میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس حقیقت کا بڑا واضح ادراک نظر آتا ہے کہ عربی اور فارسی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فرد کا معاشی مستقبل کیا ہوتا ہے۔ "مُردوں کی روٹیاں کھانے والے" وہ لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے کے لیے مفید ہونے کی بجائے معاشرے پر بوجھ بن کر رہتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر سر سید احمد خان در حقیقت تعلیم کے اس افادی پہلو پر زور دے رہے ہیں جو فرد اور معاشرے دونوں کی ترقی کا ضامن ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے فرد کی عزتِ نفس قائم رہتی ہے۔

اس اقتباس کے بعد سر سید اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں؛

"ہم کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ خود ہم نے اسی اصول پر سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی اور بہت کچھ مباحثہ اور تکرار گورنمنٹ سے کی تھی اور اب ہم اس کے بر خلاف ہیں۔ ہاں یہ بات سچ ہے۔۔۔ مگر اس زمانہ میں اور حال کے زمانہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنا کو پڑے اٹھارہ انیس برس کے قریب زمانہ گزرا۔ وہ زمانہ وہ تھا کہ اس سے تھوڑے عرصہ پیشتر ہماری ملکۂ معظمہ قیصرہ ہند نے سلطنت ہند کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اہل ہند کو مطلق معلوم نہیں تھا کہ کس سے ہمارا تعلق چھوٹا اور کس سے ہمارا

Vol. 7 No.3 2023

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

تعلق ہوا اور اس تبدیلی نے جو بظاہر صرف نام کی تبدیلی تھی اہل ہند کو کن کن حقوق کا مستحق کیا اور ان حقوق کو حاصل کرنے کے لیے انھیں اپنے تئیں کس درجہ تک لائق بنانا ضروری ہے۔“[2]

اس اقتباس میں سرسید احمد خان کے اس اعتراف کی بنیاد یہ ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی کے دور میں انھیں ادراک نہیں تھا کہ حکومت کی تبدیلی نے اہل ہند کو کیا کیا حقوق دیے ہیں۔ یہاں ہماری تہذیبی تاریخ میں تعلیم کے تصور کا دوسرا مرحلہ آتا ہے۔ یہ مرحلہ یہ تھا کہ اگر آپ ایک خاص پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کریں اور اس تعلیم میں ماہر ہوں تو آپ کا یہ حق ہے کہ حکومت کے متعلقہ شعبوں میں باعزت اور باوقار ملازمت حاصل کریں سرسید احمد خان بہت دور اندیش رہنما تھے انھوں نے بہت جلد اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ دور بدل چکا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں واضح طور پر لکھا ہے کہ انگریزی زبان اور جدید تعلیم کا حصول اب صرف سرکاری ملازمتوں کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ تجارت، صنعت و حرفت اور روزمرہ کے کاموں کے لیے بھی انگریزی ضروری ہے۔ ادنیٰ درجے کے لوگوں کو ادنیٰ درجہ کی انگریزی اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو اعلیٰ درجہ کی انگریزی کی ضرورت ہے۔

سرسید احمد خان کی اس سوچ اور اس دلیل کا ایک پس منظر تو یہ ہے کہ وہ خود بہت باریک بین اور پیش بینی کرنے والے رہنما تھے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس دور میں ایسی سماجی تبدیلیاں آ رہی تھیں جو پورے معاشرے کی تعلیمی اور فکری سمت متعین کر رہی تھیں۔ خود سرسید احمد خان نے اس کی وضاحت بڑے واشگاف الفاظ میں یوں کی ہے؛

زمانے میں کچھ خفیف تبدل نہیں آیا، بلکہ ایسا تبدل آیا جو آنکھ سے دکھائی دیتا ہے۔ تربیت یافتہ لوگوں نے ہی نہیں بلکہ عام لوگوں نے بھی اس کو بخوبی دیکھا ہے۔ ہم مثالاً اپنے ملک کی بڑی عدالت کا ذکر کرتے ہیں جبکہ صدر عدالت ہائی کورٹ نہیں ہوتی تھی، مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم و لائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب وکیل تھے کہ زمانہ ان پر رشک کرتا تھا۔ وہ نام کے مولوی عالم اور مولوی فاضل نہ تھے بلکہ حقیقتاً مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے ایسے عالم تھے کہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو ان سے آدھا بھی پیدا کرنا نہایت مشکل ہے۔ دفعتاً سن 1866 میں صدر عدالت ہائی کورٹ ہو گئی اور یورپین علوم اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ وہ بار آور درخت مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے جن کی پھننگ آسمان تک پہنچی تھی، اس طرح کملا کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدمے سے جھلس جائے۔ اب ہائی کورٹ میں جا کر علمائے علومِ مشرقی کا حال دیکھو کہ ان پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کرسکتے ہیں نہ ملک کا نہ قوم کا۔[3] اکبرالہ آبادی اپنی مذہبی اور تہذیبی روایات کے تحفظ کے لیے کوشاں تھے اور ان کا بیٹا عشرت انگلینڈ کے کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اصل بات یہ کہ جب تہذیبی رویے تبدیل ہونا شروع ہوتے ہیں تو اپنی ذاتی زندگی میں ہر فرد کو اس کا ادراک ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معاشرے میں اپنا قدیم تشخص برقرار رکھنے کے لیے لوگ اپنی کہی ہوئی بات دہراتے رہتے ہیں۔ ہر رہنما سرسید احمد خان نہیں ہوتا کہ حالات تبدیل ہو جائیں تو عوام کے مفاد کے پیشِ نظر خود کو بھی تبدیل کر لے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے اس اعتراف کا زمانہ وہ تھا جب ہمارے معاشرے کو یہ شعور حاصل ہونا شروع ہوا کہ دنیا کی تہذیب زرعی اور صنعتی دور سے نکل کر اب ایک ایسے دور میں داخل ہو رہی ہے جس کے تقاضے مختلف ہوں گے۔ اور یہی وہ ادراک تھا جس کی بنیاد پر اپنی آئندہ نسلوں کو بین الاقوامی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے معاشرے کے تمام افراد نے اپنی اولاد کو انگریزی پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح تہذیبی سطح پر ہمارے معاشرے نے کئی ادوار دیکھے اور بڑے مرحلوں سے گزر کر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ انگریزی زبان کے بغیر ان کے بچوں کا مستقبل محفوظ نہیں۔ ان مراحل کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مغلیہ دور جب تعلیم کا تصور یہ تھا کہ دورانِ تعلیم اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد طالبِ علم معاشرے کے رحم و کرم پر ہو گا۔ یہ دور شاہانِ مغلیہ کی خوشنودی کے لیے ان کی زبان سیکھنے کا دور تھا۔

۲۔ لارڈ میکالے کا زمانہ جب تعلیم کے حصول کے بعد روزگار کا دعویٰ طالبِ علم کا بنیادی حق قرار پایا۔ یہ دور وہ تھا جب ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار مفید علم کے حصول پر زور دیا گیا اور فارسی کے غلبے سے نجات کے لیے مقامی زبانوں کو فروغ ملنا شروع ہوا۔ ساتھ ساتھ انگریز افسروں اور فوج میں بھرتی کے لیے مقامی زبان پڑھنے والوں نے بھی مقامی زبان کی اہمیت کم کرنا شروع کر دی۔

Vol. 7 No.3 2023
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

۳۔سرسید کا دور جب حکمران طبقے کی زبان اور تعلیم کامیابی کی ضمانت ٹھہری۔یہ زمانہ وہ تھا جب ہندوستانی معاشرے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو انگریزی دانی کی بدولت انگریزوں کے ساتھ ساتھ حکومت میں شریک تھا اور جس نے جان لیا تھا کہ اس کی حکومت اسی میں ہے کہ وہ مقامی افراد سے اسی طرح فاصلہ رکھے جیسے انگریز افسران رکھتے ہیں۔

۴۔قیامِ پاکستان کے بعد کا زمانہ جب طاقت اور اختیار کے اداروں تک رسائی کی زبان انگریزی ہی رہی۔یہ وہ زمانہ ہے جب انگریزی دان طبقے نے بڑی مہارت سے نوآبادیاتی دور کی حکمتِ عملی کو مقامی سطح پر ایک نیا رنگ دیا اور جس طرح نوآبادیاتی دور میں ہندوستان کے عوام محکوم تھے اور انگریز ان کے حاکم تھے اسی طرح پاکستان کے عوام کو اپنا محکوم اور خود کو انگریزوں کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق حاکم بنا لیا۔

۵۔ڈاکٹر وحید قریشی کا دور جب انگریزی اور جدید تعلیم کو ایک تلخ حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔یہ وہ دور تھا جب عالمگیریت کے سائے دنیا کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے اور انگریز ی زبان دنیا میں ایسا مقام حاصل کر چکی تھی کہ اس کی تحصیل کے بغیر دنیا میں ترقی کرنا ناممکن ہو چکا تھا۔نوآبادیاتی دور کے اثرات اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ اب اردو زبان کے لیے اقتدار کی زبان بننا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔

۶۔موجودہ دور صنعتی دور کے بعد کا زمانہ ہے جسے پوسٹ انڈسٹریل ورلڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس زمانے میں تعلیم کی نوعیت بدل چکی ہے اور فرد کا مستقبل مکمل طور پر تعلیم کے حصول سے وابستہ ہوچکا ہے ایک قوم کی حیثیت سے ہم نے وہ سنہرا وقت گنوادیا ہے جب ہمارے پاس یہ موقع تھا کہ ہم اردو زبان کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرسکتے تھے۔اس زمانے میں ہم نے سرکاری سکولوں میں اردو کے نفاذ کے سوا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔اور اس کوشش کا نتیجہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ ہم نے کئی نسلوں کو اردو میں الجھا کر طبقہ اشرافیہ کے بچوں کو بڑے آرام سے طاقت و اختیار کے اداروں تک رسائی کا موقع فراہم کیا۔طبقہ اشرافیہ کی وہی نسلیں اب ہماری حکمران ہیں۔ہمارے حکمران ٹوٹی پھوٹی اردو اور بہت عمدہ انگریزی میں اظہار خیال کرتے ہیں۔تہذیبی سطح پر اردو زبان میں استعدادنہ ہونا قابلِ فخر سمجھا جاتاہے۔انگریزی زبان کی تعلیم کا معیار اب ادارے کا معیار بن چکا ہے۔جتنی اچھی انگریزی پڑھائی جائے گی تعلیمی ادارہ اتنا ہی اچھا شمار ہوگا۔بین الاقوامی طرز کے اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں کثیر الاقوامی کمپنیوں میں بڑی بڑی تنخواہوں اور اعلیٰ عہدوں کے حصول کے لیے انگریزی اور جدید علوم میں مہارت لازمی ہوچکی ہے۔یہ وہ علوم ہیں جن پر اردو زبان میں کوئی کتاب دستیاب نہیں اِن حالات میں اور اس تہذیبی پس منظر میں اردو زبان کے حامی خاموش تماشائیوں کی طرح بے بسی سے صورتِ حال کا نظارہ کررہے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سے کثیر الاقوامی کمپنیوں تک کے اس سفر میں ہمارے معاشرے نے تہذیبی سطح پر غیر ملکی تہذیب اور اس کی اقدار کے خلاف کم مزاحمت نہیں کی۔ہم موجود ہ صورتِ حال میں مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کے زوال کی ذمہ داری عام انسان پر نہیں ڈال سکتے۔اس عام انسان نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب ایک طرف راجہ رام موہن رائے جیسے ہندو رہنما تھے جو اپنی قوم کو جدید علوم سے بہرہ مند کرنے کے لیے کوشاں تھے اور دوسری طرف مسلمان علمائے کرام تھے جنھوں نے انگریزی پڑھناحرام قرار دیا اور انگریزی سے انکار کردیا۔عوام کو اس پر قائل کیا گیالیکن انھیں کوئی متبادل راستہ فراہم نہیں کیا گیا۔یہ وہ دور تھا جب انگریزی جاننے والے ہندو حکومتِ وقت سے روزگار اپنے حق کے طورپر حاصل کررہے تھے اور مشرقی علوم کے غالب اور ذوق جیسے ماہرین علوم و لسانیاتِ مشرقی دربارِ شاہی سے انعام اور خلعت کے حصول کی راہ دیکھا کرتے تھے۔لیکن اس دربار تک کتنوں کورسائی حاصل تھی۔نواب اور راجے مہاراجے کتنے لوگوں کی سرپرستی کر سکتے تھے۔مولانا حالی اور مولوی عبدالحق جیسے عظیم علماء اور محققین اگر حیدرآباد کی ریاست کی سرپرستی حاصل نہ کرسکتے تو شاید انھیں لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم بھی دستیاب نہ ہوتا۔میر امن اور للو لال کوی جیسے مشرقی علما کو فورٹ ولیم کالج میں نوکری ملی تو ان کے گھروں میں کھانا پکنا شروع ہو گیا۔عام انسانوں نے سرسید احمد خان کے اصرار پر انگریزوں سے مصالحت کا راستہ اختیار کیا تو اُن کا معاشی اور معاشرتی درجہ بدل گیا۔علیگڑھ کالج کی فارغ التحصیل نسلوں نے ہمارے معاشرے اور ہماری تہذیت کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔یہ عام انسان جو میرے اس مقالے میں تیسرا فریق ہیں، اپنی تہذیب اور اپنی اقدار سے بہت مخلص تھے۔قیامِ پاکستان کے بعد ان عام انسانوں

Vol. 7 No.3 2023
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

نے اپنی اقدار کی طرف پلٹنا چاہا۔انھوں نے قیام پاکستان کے بعد ایک بار پھر اپنی آئندہ نسلوں کی قربانی دی۔اُن کی آنکھوں کے سامنے چیف کالجوں اور انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں کے طلبا ترقی کرتے رہے اور وہ اپنی اولاد کو اردو اورلازمی عربی میں الجھا ہوا دیکھتے رہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو سے محبت اپنی جگہ لیکن اپنی اولاد کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے انھیں انگریزی زبان میں تعلیم دینا ضروری ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعدیہ بحث ہماری تہذیب کا حصہ بن کررہ گئی تھی کہ تعلیمی اداروں، عدالتوں اور دفاتر کی زبان اردو ہونی چاہیے یا انگلش۔ اردو اور انگلش میڈیم کی یہ تفریق ابھی تک اتنی واضح اور لازمی ہے کہ ان دونوں طبقوں کی تہذیب ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔اردو میڈیم طبقے کا عمومی لباس شلوار قمیض ہے اور انگریزی میڈیم کا پینٹ کوٹ ٹائی اور جینز وغیرہ۔یہ تفریق سرکاری اور پرائیویٹ سکولوں کی وردی میں بھی نظر آتی ہے۔اردو میڈیم طبقے کا کھانا دیسی ہے مشروب روح افزا اور اس طرح کے دیگر مشروب ہیں جبکہ انگریزی میڈیم طبقہ کوک،پیپسی اور برگر کے حوالے سے پہچانا جاتاہے۔اردو میڈیم طبقے کی موسیقی انگریزی میڈیم سے الگ ہے ان کا ملنا جلنا رہنا سہنا رسوم و رواج سب کچھ اتنا الگ ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ملک میں دو الگ الگ شہر آباد ہوں۔اس ضمن میں سب سے بڑا فرق معیشت کا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اردو میڈیم طبقہ معاشی طورپر کمزور اور محکوم طبقہ ہے۔اس طبقے سے اگر کوئی اپنی ذاتی صلاحیت سے کاروباری اور معاشی ترقی حاصل کرلیتا ہے تو اس کی آئندہ نسلیں بڑے بڑے انگریزی میڈیم سکولوں سے تعلیم حاصل کرکے انگریزی میڈیم تہذیب کا حصہ بن جاتی ہیں۔

اس تمام تہذیبی تفریق میں ایک بات بہت نمایاں ہے کہ مجموعی طور پر انگریزی میڈیم طبقہ کامیاب لوگوں کا طبقہ تسلیم ہوتا ہے جبکہ اردو میڈیم ناکام اور کمتر لوگ تسلیم کیے جاتے ہیں۔معاشرے کا یہ رویہ انگریزی میڈیم سکولوں کی فضا کو بھی متاثر کرتا ہے جہاں اردو زبان کا شعبہ ہمیشہ کمتر شعبہ سمجھاجاتا ہے۔اسی طرح اسلامیات اور مطالعہ پاکستان جیسے مضامین بھی غیر اہم سمجھے جاتے ہیں۔

پاکستانی تہذیب کے اس دہرے نظام میں انگریزی زبان کے حق اور اردو زبان کی مخالفت میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی رہی کہ اردو زبان میں ابھی سرکاری اور تعلیمی زبان بننے کی استعداد نہیں اور انگریزی ایک مکمل اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ اور ان کے رفقاء کی طرف سے اس اعتراض کے بہت جوابات دیے جاتے رہے لیکن ڈاکٹر طارق رحمن نے اس سلسلے میں بڑی مدلل اور مبنی برحقیقت بحث کی ہے4جنوری 1991 اور11جنوری 1991میں ”دی مسلم“ میں شایع ہونے والے مضمون "Linguistic prejudice" میں انھوں نے اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔وہ کہتے ہیں زبان کے انتخاب کے سلسلے میں ہونے والی تمام بحث میں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبان کی اصطلاحات سامنے آتی ہیں۔موجودہ تناظر(حیثیت، ذریعہ تعلیم، انتظامیہ اور عدلیہ وغیرہ) میں ترقی یافتہ زبان سے مراد وہ زبان ہے جو اظہار کی قدرت رکھتی ہو یا جس میں مناسب اور کافی ذخیرہ الفاظ موجود ہو۔وہ لکھتے ہیں۔

The fact is that every language, is meant to express the social reality of its speakers

یعنی حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان اپنے بولنے والوں کی سماجی حقیقتوں کے اظہار کے لیے ہونی ہے۔[7]

اس سے مراد یہ ہے کہ زبان جس علاقے اور خطے میں بولی جاتی ہے وہیں کی تہذیب کی مظہر ہوتی ہے۔مثال کے طور پربرفانی علاقوں کے رہنے والے اسکیمو لوگوں کی زبان میں برف کے کئی مترادف الفاظ ملیں گے کیونکہ اُن کے اردگرد موجود سماجی حقائق کا برف سے گہرا تعلق ہوگا۔عربی میں اونٹ کے لیے بے شمار الفاظ ہیں۔گاؤں کی زبان میں زیادہ الفاظ اُن اشیا کے ہوں گے جو گاؤں میں دستیاب ہوتی ہیں اور زراعت سے وابستہ ہیں۔کسی بھی سماج کی مخصوص اقدار اور رسوم کا درست اظہار اسی سماج کی زبان میں ہوتا ہے دیگر زبانوں میں یہ اقدار اور رسوم و رواج بیان تو ہوجائیں گے لیکن ٹوٹے پھوٹے انداز میں ہی بیان ہوں گے۔

اس موقع پر ڈاکٹر طارق رحمن انسانی رشتوں کی مثال دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان میں رشتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی زبان میں کزن، انکل اور آنٹی کے تفصیلی الفاظ دیکھتے ہیں۔مثلاً ماموں، چچا، خالہ، پھوپھو وغیرہ۔یہ الفاظ ہمیں متعلقہ فرد کے ساتھ رشتے

Vol. 7 No.3 2023
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

اور اس کی جنس کے بارے میں مکمل معلومات دیتے ہیں۔اگر ہم اپنی رشتوں کو انگریزی میں بیان کرنے کی کوشش کریں تو ہم انھیں لفظ کی بجائے جملے کی صورت میں بیان کریں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی میں موجود الفاظ جنوبی ایشیا کی تہذیب کے ان رشتوں کی تفصیل نہیں بتاتے۔دوسری طرف انگریزی زبان میں اُن کے عدالتی نظام، یونیورسٹیوں اور انتظامیہ کے معاملات کے لیے کئی اصلاحات ہیں جو اردو میں موجود نہیں ہیں۔اب اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اردو زبان غیر ترقی یافتہ یا کمتر زبان ہے، مسئلہ یہ ہے کہ یہ زبان اُن تمام تہذیبی مظاہر کے اظہار کے لیے بنی ہی نہیں جو مغرب میں تخلیق ہوئے اوربعد ازاں انھیں مشرقی ممالک میں درآمد کیا گیا۔

یہ دلیل بالکل درست ہے اور پاکستان میں اردو زبان پر کیے جانے والے اعتراضات کا سب سے مدلل جواب ہے۔لیکن اسی حقیقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر پاکستان کی موجودہ تہذیب اور اس تہذیب کے پس منظر میں کارفرما تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریزی زبان میں مہارت کے حصول کے لیے اس خطے کے عوام نے اپنی تہذیب تبدیل کر دی۔یہی وجہ ہے کہ جدید انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو پری سکول، جسے مانٹیسوری اور کنڈرگارٹن کا نام بھی دیا جاتا ہے، میں داخل کرایا جائے۔پری سکول میں تعلیم کا آغاز ”پلے گروپ“ سے ہوتا ہے اور پلے گروپ میں داخلہ لینے والے طالبِ علم کی اوسط عمر اڑھائی سال ہوتی ہے۔یہ وہ عمر ہے جب بچہ بمشکل بولنے کے قابل ہوتا ہے۔بلکہ اب تو ایسے ادارے بھی موجود ہیں جہاں اس عمر سے پہلے یعنی ڈیڑھ سال کی عمر کے بچوں کو ”بے بی سٹنگ“ کے نام پر اکٹھا کرلیا جاتا ہے۔اِن بچوں کو ان اداروں میں مغربی تہذیب کے سائے میں رکھا جاتا ہے تاکہ انگریزی زبان اُن کے لیے اجنبی نہ رہے اور وہ اردو اور پنجابی کے سائے سے محفوظ رہیں۔بعد ازاں اچھے انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں میں خصوصیت کے ساتھ اہتمام کیا جاتا ہے کہ طلبا سکول کی حدود میں اردو زبان استعمال نہ کریں اور زیادہ سے زیادہ انگریزی بولیں۔

اِن طلبا کے چاروں طرف موجود تہذیب ہر اعتبار سے انگریزی تہذیب ہوتی ہے۔چنانچہ ان طلبا کے بارے میں بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ پاکستان میں رہنے والے وہ افراد ہیں جن کا تہذیبی پس منظر انگلستان کی تہذیب سے جنم لیتا ہے۔یہ درست ہے کہ اردو زبان میں مختلف رشتوں کے لیے بہت سے الفاظ موجود ہیں اور جنوبی ایشیا کے اس رشتوں کے نظام کی توضیح کے لیے انگریزی زبان میں ذخیرۂ الفاظ موجود نہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ اردو زبان کے یہی الفاظ اور اسی قسم کا ذخیرۂ الفاظ انگریزی میڈیم کرنے والے پاکستانی طالب علم کے لیے ناقابل فہم ہے اور اس کے لیے مسائل پیدا کرتا ہے۔اردو کے استاد کی حیثیت سے راقم کامشاہدہ ہے کہ وہ الفاظ اور اصطلاحات جن کا تعلق مشرق کی تہذیبی اقدار سے ہے، اولیول کے اِن طلبا کے لیے اتنے ہی اجنبی ہیں جتنے کسی بھی انگریزی کے لیے ہوسکتے ہیں۔مثلاً لفظ ”حیا“ جو خالصتاً مشرقی تصور سے وابستہ ہے اولیول کے طلبا کے لیے ایک عجیب و غریب لفظ ہے کیونکہ وہ اس لفظ کو انگریزی لفظ "shame" کے حوالے سے دیکھیں گے shame کا تصور کسی غلطی سے وابستہ ہے اس لیے یہ طلبا لفظ ”حیا“ اور ”لاج“ کے معنی سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کیونکہ کسی غلطی کے بغیر shame کا تصور اُن کی تہذیب میں شامل نہیں۔اسی طرح موجودہ دور میں لفظ ”غیرت“ کی وجہ سے یہ نیم انگریز طبقہ بہت پریشان ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب میں انگریزی میڈیم کے طالبِ علم پر نوآبادیاتی دور کے اثرات کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہوتی ہے کہ جس طرح اردو میڈیم کے ایک طالبِ علم کو انگریزی زبان کی تحصیل میں اس لیے مشکلات پیش آتی ہیں کہ اس نے انگریزی تہذیب میں جنم نہیں لیا اور وہ انگریزی زبان کے پس منظر میں کارفرما تہذیبی مظاہر سے لا علم ہوتا ہے اسی طرح پاکستان میں رہنے والا دورِ حاضر کا انگریزی میڈیم کا طالب علم اردو زبان کے پس منظر میں کارفرما تہذیبی مظاہر سے واقف نہیں ہوتا۔وہ انگریزی زبان کو اپنی تہذیبی زبان کے طور پر پڑھتا ہے اور اردو اس کے لیے غیر ملکی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ گذشتہ تیس سال کے عرصے میں ہمارے معاشرے کی کئی نسلیں انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرونِ ملک سے اور بیرونی طرز کی مقامی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد عملی زندگی میں اپنا کردار ادا کررہی ہیں۔یہ تمام نسلیں ہماری تہذیب اور ہمارے تعلیمی کلچر کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے حکومتی اداروں پر انہی نسلوں کا تسلط ہے۔ان حالات میں اردو زبان کا مستقبل انہی

Vol. 7 No.3 2023

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

نسلوں کے ذہنیرویوں سے وابستہ ہوچکاہے۔انگریزی تعلیم کا سلسلہ اتنا پھیل چکا ہے اور بین الاقوامی تجارتی اور تہذیبی تناظر میں اتنی زیادہ اہمیت اختیار کرچکا ہے کہ اب اس کی واپسی کا عمل تقریباً ناممکن ہے۔اس وقت دورِ حاضر کے پاکستان میں ہم اس موڑ پر کھڑے ہیں جہاں اپنی قومی زبان میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کے لیے سکالر کو انگریزی زبان کے سوالات پر مبنی امتحان سے گزرنا پڑتا ہے کہ اگر آپ انگریزی میں مناسب استعداد نہیں رکھتے تو آپ کو اردو زبان میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کا حق حاصل نہیں۔ایسا صرف اس لیے ہوا ہے کہ فیصلے اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو اردو زبان کو بے حقیقت اور بے کار زبان سمجھتے ہیں اور چونکہ خود اس زبان میں استعداد نہیں رکھتے اس لیے سمجھتے ہیں کہ اردو زبان اس قابل ہی نہیں کہ اسے انگریزی اور سائنس کے مقابلے میں اہمیت دی جائے۔

اس سلسلے میں خود اردو دان طبقہ بھی کم قصوروار نہیں۔میری ذاتی رائے میں اردو زبان کو ہمارے دوتہذیبی رویوں نے حد سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔پہلا رویہ ان حضرات کا ہے جو قیام پاکستان کے بعد دہلی اور لکھنو سے ہجرت کرکے آئے تھے اور چونکہ اردو جانتے تھے اس لیے اہم مناصب پر فائز ہوگئے۔اہم مناصب سے مراد طاقت اور اختیار کے ادارے نہیں بلکہ وہ ادارے ہیں جہاں سے اردو کی ترقی اور اس کے دفاع کے لیے درست سمت میں کوشش کی جاسکتی تھی۔اِن لوگوں کا رویہ یہ تھا کہ دہلی اور لکھنو کی زبان سند ہے اس لیے وہ زبان اور اردو کا وہ لہجہ جس میں مقامی لہجوں کی آمیزش ہو معیاری نہیں۔اس روش کے نتیجے میں اردو زبان کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور اسے "پاکستانی اردو" بنانے کی بجائے اسے دہلی اور لکھنو کی اردو بنانے پر زور دیا جاتا رہا اور نصابات میں وہ ادب شامل ہوتا رہا جو قیام پاکستان سے قبل کے دہلی اور لکھنو کی تہذیب پیش کرتا تھا۔اس ضمن میں ڈاکٹر روش ندیم کا ایک مضمون بہت اہمیت رکھتا ہے جو روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں شامل تھا۔[8]

ڈاکٹر صاحب نے پاکستان میں اردو زبان کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے مستقبل کے حوالے سے لکھتے ہوئے کچھ بہت اہم باتیں لکھی ہیں،لکھتے ہیں؛

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس معاشرے میں پنجابی،سرائیکی، پشتو، سندھی، بلوچی، براہوی، ہندکو، پوٹھواری،ہریانوی، جٹکی اور گوجری زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں اردو کا ایک گہرا تعلق ان زبانوں سے جوڑا جاتا اورانہی کی بنیاد پر پاکستانی اردو کی تشکیل کی جاتی لیکن معاملہ اس کے بالکل الٹ ہوا۔اردو جو اپنی بنیاد ہی میں دوسری زبانوں کے اشتراک سے ترقی کرتی ہے اسے ان مقامی زبانوں سے لڑوادیا گیا"۔[9]

اس لڑائی کی بنیاد کیا ہوسکتی ہے؟ کیا محض یہ کہ دنیا کافی ہے کہ جب بھی اردو زبان کے فروغ کی بات کی جاتی تھی تو ایک مخصوص طبقہ مقامی زبانوں کا تنازعہ کھڑا کردیتا تھا؟ میرے خیال اس لڑائی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دہلی اور لکھنوکے اردو دان طبقے نے مقامی زبانوں کو اردو سے دور رکھنے کی جو روش اپنائی تھی یہ اسی کا ردعمل تھا کہ مقامی زبانوں کو اپنی بقا کے لیے اردو سے لڑنا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں۔

"تعلیمی اداروں کے ذریعے اور دانشوروں کے حمایت کے ذریعے پچھلی آدھی صدی سے دہلی و لکھنو کے طبقہ اشرافیہ کی عربی و فارسی زدہ اردو کو ہم جوں کا توں مسلط کئے ہوئے ہیں۔ادبی و تخلیقی سطح پر ادیبوں اور شاعروں نے بھی اردو کے اسی چلن کی ترویج کی، ان کے نزدیک آج بھی زبان عوام کی بجائے گرامر کی موٹی موٹی کتابوں میں ہی محفوظ ہوتی ہے"۔[10]

دہلی اور لکھنو سے ہجرت کرکے آنے والے اردو دان طبقہ اشرافیہ کے مذکورہ اقدامات کے علاوہ اردو زبان کو پاکستان میں جس عنصر سے نقصان اٹھانا پڑا وہ یہ ہے کہ اس زبان کو بے جاطور پر اسلام اور اسلامی تہذیب سے وابستہ کردیا گیا۔اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ جب اردو زبان عربی اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو یہ مسلمانوں کی تہذیبی زبان بن جاتی ہے۔اسی لیے جب اس زبان کو سنسکرت رسم الخط سے لکھنے پر اصرار کیا گیا تو اردو ہندی تنازع کی صورت میں ایک طویل کشمکش نظر آئی جو اس نتیجے پر اختتام پذیر ہوئی کہ اردو زبان مسلمانوں کی پہچان بن گئی اور قیام پاکستان کے بعد نظریہ پاکستان اور اسلام کے ساتھ اس ملک کے جواز کا تیسرا عنصر ٹھہری۔بات یہاں تک درست تھی۔بلاشبہ اردو زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے اور اس طرح اس زبان کے ذریعے

Vol. 7 No.3 2023
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

مذہبی اسلامی تحریروں اور قدیم اسلامی علوم تک پاکستانی معاشرے کی رسائی کا راستہ کھلا رکھنے کی کوشش میں اردو زبان کے اکابرین نے بہت محنت کی یہ کوشش کامیاب ہوئی یا نہیں اس سے فی الحال ہمیں بحث نہیں۔مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ جب اردو زبان کو اسلام کی مذہبی زبان کے طور پر پیش کیا گیا اور اسے اسلامی تہذیب کی علامت قرار دینے پر زور دیا گیا تو لامحالہ انگریزی زبان عیسائیوں کی مذہبی زبان اور عیسائیوں کی تہذیب کی علامت ٹھہری۔چنانچہ تہذیبی سطح پر ایک کشمکش شروع ہوگئی جس میں ایک طرف وہ علمائے کرام تھے جو اردو زبان کی سرپرستی کررہے تھے اور اپنا روزگار حاصل کرنے کے لیے یا تو مساجد میں بیٹھ کر معاشرے کی زکوۃ اور چندے کے منتظر رہتے تھے یا پھر بیرونِ ملک عیسائیوں کے ملکوں میں جاکر چندے کی صورت میں ڈالر اور پونڈ کماتے تھے۔دوسری طرف وہ فوجی جنرل اور افسر شاہی کے طاقتور نمائندے تھے جن کی زندگی منت اور خوشامد کی مجبوری سے پاک تھی۔اردو دان طبقے کا مستقبل اپنی بلندترین سطح پر یہ تھا کہ وہ کسی کالج یا یونیورسٹی کے استاد بن جاتے تھے اور انگریزی دان طبقے کے افراد ملک کی تقدیر کے فیصلے کرتے تھے۔ان حالات میں عام لوگوں کے لیے اردو اور انگریزی زبان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا بڑا آسان تھا اور عام انسانوں نے اردو جیسی مذہبی زبان پڑھ کر مولوی بننے کی بجائے انگریزی پڑھ کر ملک کی تقدیر کا مالک بننا زیادہ پسند کیا۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کو بلاجواز اسلامی تہذیب اور پاکستان کے مذہب سے وابستہ کردیا گیا تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ بلاشبہ ہمارے اپنے ادب اور قرآنِ پاک کے تراجم اور تفاسیر کا اردو زبان سے گہرا تعلق ہے لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت اور اس میں موجود علمی، تاریخی، دینی اور معاشرتی سرمائے کو اس لیے ادبِ عالیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے کہ اس کا اسلامی تہذیب سے گہرا تعلق ہے تو یہ بات بڑی حد تک غیر حقیقی محسوس ہوتی ہے۔اس ضمن میں مزید وضاحت کے لیے ذیل میں انوار احمد زئی کے ایک مضمون ”اسلامی تہذیب اور اردو زبان“ کا حوالہ دیا جارہا ہے۔یہ مضمون جنرل ضیاء الحق کے اسلامی مارشل لا کے دور میں اگست ۵۸۹۱ میں مقتدرہ قومی زبان کے رسالے ”اخبارِ اردو“ میں شائع ہوا تھا[11]۔

اس مضموں مین مصنف نے سب سے پہلے اسلامی تہذیب کو ایک ایسی تہذیب قرار دیا ہے جس کا تعلق کسی خطے یا قوم سے نہیں۔وہ لکھتے ہیں۔

”جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو پھر اس میں تہذیب کی بھی اس محدود تعریف کے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی جس کی اساس مغربی طرز کی قومیت پر قائم ہوتی ہے۔اس لیے ہمیں اسلامی تہذیب کی اصطلاح کے لیے عمومی تہذیب کی تعریف سے ذرا بلند ہو کر گفتگو کرنا پڑے گی“۔(ص99)

مغربی طرز کی قومیت پر مبنی تہذیب کی یہ محدود تعریف مصنف کے نزدیک کچھ یوں ہے۔

”مغرب کے تصور کے مطابق کسی ایک خطہ زمین میں کسی ایک طرز کی حکومت کے تابع رہ کر کسی ایک اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے رہنے والی آبادی کو قوم کیا جاتا ہے۔اور یہ اپنے کل میں مزید چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو تسلیم کرتی ہے۔اس طرح کا کوئی تصورِ قومیت اسلام میں روا نہیں ہے“ (ص۹۹) اور تہذیب کے اس محورور تصور سے بلند ہوکر اسلامی تہذیب کا تصوریہ ہے کہ ”زمانی و مکانی حدبندیاں ڈھاکر اسلامی تہذیب پر گفتگو کرنا مناسب ہوگا (ص ۰۰۱) اور ”ان مکانی قیود میں جہاں لباس و معاشرت، رسم و رواج اور رہن سہن کے آداب آجاتے ہیں وہیں زبان کی رکاوٹ بھی دور ہوجاتی ہے“۔(ص ۰۰۱)

اِن بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان دنیا کے کس بھی علاقے کا رہنے والا اور کوئی بھی زبان بولنے والا کیوں نہ ہو وہ صرف مسلمان ہے اور اس کی تہذیب کی اساس اس کا ایمان اور عقیدہ ہے۔میں اس وقت اس بحث میں ہرگز نہیں پڑنا چاہتا کہ ایمانیات اور رسومات کو آپس میں کس حد تک مربوط کرنا چاہیے مقصود صرف یہ جاننا ہے کہ اسلامی تہذیب کے اس تصور کے تحت اردو زبان کا کیا منصب ہے۔منشی پریم چند، عصمت چغتائی، منٹو، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی اور مشتاق احمد یوسفی جیسے لوگ تہذیب کے اس تصور کے تحت کس مقام پر فائز ہوتے ہیں۔اقبال کے بعد اردو میں کون سے شاعر ہیں جنھیں اسلامی تہذیب سے ایسی وابستگی ہو کہ مکانی حدود ختم ہوجائیں ہم میراجی، ن۔م۔راشد اور مجید امجد کا کیا درجہ متعین کریں۔

Vol. 7 No.3 2023
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

حقیقت یہ ہے کہ اردو کو اسلامی تہذیب سے وابستہ کرنے کے اس تصور نے اس زبان کو بہت زیادہ محدود کردیا ہے۔جدید دور میں اردو زبان کے نفاذ کے سلسلے میں ایک بہت بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ خود اردو کے حامی اردو کے بنیادی کردار کے بارے میں متفق نہیں ہیں کہ اس کا کردار سیکولر اور عوامی ہونا چاہیے یا مذہبی اور خصوصی۔انہی اختلافات نے تہذیبی سطح پر اردو زبان کو صرف ایک مخصوص طبقے کی زبان بناکررکھ دیا ہے اور بدقسمتی سے یہ طبقہ اپنے سماجی اور سیاسی کردار کی وجہ سے نئی نسل میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کرسکا۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں تہذیبی سطح پر پاکستانی طلبا کو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔یہ دور بڑی تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیب کا دور ہے۔الیکٹرانک میڈیا کی ترقی، انفارمیشن ٹیکنالوجی، کمپیوٹراور انٹرنیٹ کی دنیانے قدیم دور کے تمام تصورات بدل کر رکھ دیے ہیں۔ قلم کی جگہ کی بورڈ نے لے لی ہے اور دفتروں کی فائلیں اور کاغذات کمپیوٹر میں سمٹ گئے ہیں۔کام اور ملازمت کی نوعیت ایسی تبدیل ہوئی ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ نئے سرے سے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔اس تبدیلی نے جدید دور کی نوجوان نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔چنانچہ وہ طالب علم جو اس سے پہلے طاقت اور اختیار کے اداروں تک رسائی اور کثیر الاقوامی کمپنیوں میں ملازمت کے حصول کے لیے انگریزی زبان پڑھنے پر مجبور تھا اب محض تعلیم برائے تعلیم کے لیے بھی انگریزی کا محتاج ہوکررہ گیاہے۔بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اردو زبان بدلتی ہوئی تہذیب کا ساتھ نہیں دے سکی اور اردو زبان اور اس کے بولنے والے ترقی کی اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

[1] اسماعیل پانی پتی، محمد(۱۹۹۱)۔مضامین سرسید، حصہ ہشتم،لاہور: مجلس ترقی ادب۔ص43
[2] اسماعیل پانی پتی، محمد(۱۹۹۱)۔مضامین سرسید، حصہ ہشتم،لاہور: مجلس ترقی ادب۔ص 44)
[3] اسماعیل پانی پتی، محمد(۱۹۹۱)۔مضامین سرسید، حصہ ہشتم،لاہور: مجلس ترقی ادب۔ص45-46
[4] اسماعیل پانی پتی، محمد(۱۹۹۱)۔مضامین سرسید، حصہ ہشتم،لاہور: مجلس ترقی ادب۔ص45-46
[5] وحید قریشی، ڈاکٹر(1998)۔تعلیم کے بنیادی مباحث۔اسلام آباد: انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز۔ص 131۔
[6] Tariq Rehman: "Linguistic prejudice", in: "unpleasant Essays", Lahore, vanguard, 2000, p.44.
[7] روزنامہ "جنگ" راولپنڈی ، ۲۱ اگست2002۔
[8] Ibid
[9] Ibid
[10] انوار احمد زئی (1985) اسلامی تہذیب اور اردو زبان، مشمولہ اخبارِ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان۔